سورۃ البقرۃ (٢٠)

(آیات: ٢٨، ٢٩)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ٢:٥:١(٣) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ٢:٥:٣ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

٢:٢٠ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢٨ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ
فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝٢٩

© rasailojaraid.c

۲:۲۰:۱ اللغة

۲:۲۰:۱ (۱) [كَيْفَ] یہ اسماءِ استفہام میں سے ایک اسم ہے جس کا اردو ترجمہ "کیسے؟، کیسا؟، کیوں کر؟، کس طرح؟" سے کیا جاتا ہے۔ اس کا مادہ "ك ی ف" اور وزن "فَعْلَ" ہے (یعنی اس کے آخر پر تنوین نہیں آتی بلکہ یہ ہمیشہ فتحہ (ـَ) پر مبنی ہوتا ہے)۔ عربی زبان میں اس مادہ سے ایک فعل ثلاثی مجرد "کاف..... یکِیفُ کیفًا (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی "..... کو کاٹ دینا" ہوتے ہیں اور مزید فیہ کے ایک دو ابواب سے بھی فعل آتے ہیں۔ اور اس مادہ سے بعض جدید فنی اصطلاحات کے لیے بھی فعل بنا لیے گئے ہیں۔ مثلاً "کَیَّفَ اور تکَیَّفَ" بمعنی "ائیر کنڈیشن کرنا اور ہونا"۔ اسی مادہ سے ماخوذ لفظ "کیفیت" اردو میں مستعمل ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوا۔

● بعض دوسرے اسماءِ استفہام کی طرح "کیفَ" کے استعمال کے بارے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) یہ لفظ عموماً تو استفہام (کچھ دریافت کرنا) کے لیے آتا ہے اور بطور استفہام بھی کبھی تو صرف "حال دریافت کرنے" کے لیے آتا ہے جیسے "کیفَ انت؟ (تیرا کیا حال ہے)" اس صورت میں اسے استفہامِ حقیقی کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ لفظ اظہارِ تعجب کے لیے آتا ہے جیسے اسی زیر مطالعہ آیت میں ہے (گویا یہ "کتنی عجیب بات ہے کہ" کے معنی میں ہے)، اور کبھی یہ (کیفَ) دراصل نفی یا انکار کے لیے آتا ہے جیسے "کیف یکون للمشرکین عھدٌ" (التوبۃ: ۷) میں (بمعنی کیوں کر: یعنی "نہیں") ہے اور کبھی یہ (اسم استفہام) دراصل توبیخ یعنی جھڑک دینے کے لیے آتا ہے جیسے "انظر کیف ضربوا لك الامثال (الفرقان: ۹) میں ہے۔

.com
com

(۲) کبھی یہ (کیف) اسم شرط کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے مگر شرط اور جوابِ شرط کا فعل لفظاً اور معنی کے لحاظ سے ایک ہی ہوتا ہے اور اس میں کوئی فعل مجزوم نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ "جیسا...... ویسا" کی طرح کیا جاتا ہے مثلاً "کیفَ تصنعُ اصنعُ" (تو جیسا کرے گا میں ویسا ہی کروں گا)۔ اس میں دو مختلف فعل استعمال نہیں ہو سکتے مثلاً "کیفَ تکتبُ اقرءُ" کہنا بالکل غلط ہے۔ اگر "کیف" کے ساتھ "مَا" بھی لگا ہو یعنی "کیفما" استعمال کریں تو پھر یہ ایسے اسم شرط کا کام دیتا ہے جس میں شرط اور جوابِ شرط کے فعل مجزوم ہوں گے۔ مثلاً "کیفما تصنعْ اصنعْ"۔ قرآن کریم میں "کیفما" کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ "کیفَ" بھی اسمِ شرط کے طور پر کہیں نہیں آیا۔

● یہ وضاحت تو "کَیفَ" کے لغوی معنی (حسبِ موقع) کے لحاظ سے ہے۔ بلحاظِ اعراب "کیفَ" کبھی خبر کے طور پر آتا ہے، کبھی حال کے طور پر اور کبھی مفعول (ثانی یا مطلق) کے طور پر آتا ہے۔ اس کا بیان ابھی آگے "الاعراب" میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لفظ "کیفَ" قرآن کریم میں ۸۳ جگہ وارد ہوا ہے اور مذکورہ بالا تمام معانی (استفہام، تعجب، انکار اور توبیخ) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہر جگہ اس کے معنی کا تعیّن سیاق و سباقِ عبارت سے ہو سکتا ہے۔

[تَکْفُرُوْنَ] کا مادہ "ک ف ر" اور وزن "تَفْعُلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے معنی و استعمال پر البقرہ : ۶ میں بات ہو چکی ہے دیکھیے ۲:۵:۱(۱)۔ یہاں بھی یہ اسی فعل مجرد (کفَر یکفُرُ) سے فعل مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس کا ترجمہ "تم کفر کرتے ہو، کفر کر سکتے ہو، کافر ہوتے ہو، انکار کر سکتے ہو، منکر ہو سکتے ہو، منکر ہو گے، ناسپاسی (ناشکری) کرتے ہو، نہیں مانتے ہو" سے کیا گیا ہے گویا "کفر" کے معنی "انکار"، ناشکری اور نہ ماننا بھی ہیں۔ یہ صیغۂ فعل (تکفرون) مختلف صورتوں (مرفوع، منصوب، مجزوم) میں قرآن کریم کے اندر ۱۹ جگہ استعمال ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

[بِاللّٰهِ] فعل "کفر" کے باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ استعمال اور اس کے معنی پر ۲ : ۵ : ۱(۱) میں بات ہو چکی ہے ۔ اس لیے یہاں " بِ " کی وجہ سے (کفر) " باللہ " کا (مصدری) ترجمہ " اللہ سے کفر کرنا ، ......کا منکر ہونا ، ......کی ناسپاسی کرنا ، ......کو نہ ماننا ، ......کا انکار کرنا " کے ساتھ ہوگا۔ یعنی اوپر " تکفرون " صیغہ مضارع کے جو معنی مذکور ہوئے ہیں ان سے پہلے اسم جلالت " (اللہ) سے ، کا ، کی ، کو " لگا دینے سے " تکفرون باللہ " کا مکمل ترجمہ سامنے آجاتا ہے ۔

[وَ] " وَ " کے مختلف معنی پر ۱ : ۴ : ۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں (زیرِ مطالعہ آیت میں) " واو " کو حالیہ سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ " درانحالیکہ ، حالانکہ ، تمہارا حال یہ ہے کہ اور جس حال میں کہ " سے کیا گیا ہے ۔ بعض نے " اَور " سے بھی ترجمہ کر دیا ہے (جو اردو میں حالیہ اور مستانفہ واو کے لیے مستعمل ہے) ان سب میں سے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ غالباً " حالانکہ " ہے ۔ " درانحالیکہ " میں فارسیت زیادہ ہے اور باقی تراجم میں قدیم زبان یا محض لفظی ترجمہ کا عنصر زیادہ ہے۔

[كُنْتُمْ] کا مادہ " ک و ن " اور وزن اصلی " فَعَلْتُمْ " ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے معنی و استعمال اور خود اسی صیغہ " كُنْتُمْ " کی بناوٹ ، اس کی تعلیل اور معنی وغیرہ پر البقرہ : ۲۳ یعنی ۲ : ۱۷ : ۱(۱) کے ساتھ بات ہو چکی ہے ۔ اسی لیے " کنتم " کا ترجمہ " تم تھے " سے کیا جاتا ہے اور یہاں یہ بطور فعل ناقص استعمال ہوا ہے۔

۲ : ۲۰ : ۱(۲) [اَمْوَاتًا] کا مادہ " م و ت " اور وزن (یہاں) " اَفْعَالًا " ہے۔ (جو " امواتٌ " بروزن " افعالٌ " کی منصوب شکل ہے ۔ لفظ " اَمْوَات " جمع مکسر کا صیغہ ہے ۔ اس کا واحد " مَيْتٌ " ، اور " مَيِّتٌ " ہے جن کی جمع مکسر " اموات " کے علاوہ " مَوْتٰی " بھی آتی ہے ۔ اور اس کی جمع مذکر سالم (صرف عاقل مخلوق کے لیے) " مَيِّتُوْنَ " اور " مَيْتُوْنَ " بھی آتی ہے ۔ البتہ مؤخر الذکر

com

جمع (مَیِّتُوْن) قرآن کریم میں مستعمل نہیں ہوئی ــ باقی تینوں صورتیں (اموات، مَوتیٰ اور مَیِّتون) استعمال ہوئی ہیں۔

● اس مادہ (م و ت) سے فعل ثلاثی مجرد "مَاتَ یَمُوْتُ (دراصل مَوَتَ یَمْوُتُ) مَوْتًا" زیادہ تر باب "نصر" سے آتا ہے۔ اور کبھی "مَاتَ یَمَاتُ (دراصل مَوِتَ یَمْوَتُ) مَوْتًا" (باب سَمِعَ سے) بھی آتا ہے۔ اور یہ اجوف یائی کے طور پر (م ی ت) مادہ سے بھی "مَاتَ یَمِیْتُ مَیْتًا" بھی استعمال ہوتا ہے۔ سب (ابواب) سے اس فعل کے بنیادی معنی "مرنا، مرجانا، روح کا جسم سے جدا ہونا یا ہوجانا" ہیں۔ پھر اس کے فاعل کے طور پر ذکر ہونے والی چیز (مثلاً: الطریق یا النار یا الارضُ وغیرہ) کے مطابق اس فعل میں متعدد مجازی اور محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس فعل (مَاتَ) کا استعمال انسان، حیوان، نباتات سب پر ہوتا ہے۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے افعال کے مختلف صیغے ۳۹ جگہ آئے ہیں، جن میں سے ۹ جگہ تو صیغہ فعل ماضی کا ہے جسے مندرجہ بالا تین ابواب میں سے کسی سے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۱۲ جگہ ایسے صیغے آئے ہیں جو باب نصر سے ہی ہو سکتے ہیں اور باقی ۹ جگہوں پر ایسے صیغے بھی آئے ہیں جن کو باب "سَمِعَ یا ضرب" (دونوں) سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مادہ (موت) سے مزید فیہ کے بابِ افعال کے مختلف صیغے بھی ۲۱ جگہ وارد ہوئے ہیں۔

● کلمہ "اموات" جو قرآن کریم میں کل ۶ جگہ استعمال ہوا ہے، کا واحد (مَیِّت یا مَیْتٌ) اسم الفاعل (رمائت: مرجانے والا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ "مردہ، بے جان، بے روح" کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی عبارت میں ان کے معنیٔ مراد کا تعیّن اصولِ تفسیر کی مدد سے یا مستند تفسیر کے حوالے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ویسے اس بارے میں "اصول" یہ ہے کہ کسی بھی عبارت میں بنیادی طور پر کسی

© rasailojaraid.com

لفظ کے "حقیقی" معنی ہی مراد ہوں گے اِلّا یہ کہ کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جو مجازی یا استعارہ والے معنی مراد لینا ضروری قرار دے۔ اور اس "قرینہ" کے تعیّن کے لیے کسی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

۲:۲۰:۱(۳) [فَاَحۡیَاکُمۡ] اس کی ابتدائی "فاء" (فَ) تو عاطفہ بمعنی "پس" یا "پھر" ہے۔ آخری ضمیر منصوب (کُمۡ) کے معنی یہاں "تم کو یا تمہیں" ہیں۔ اور اس "فَ" اور "کُمۡ" کے درمیان فعل "اَحۡیَا" ہے جس کا مادہ "ح ی ی" اور وزن اصلی "اَفۡعَلَ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "اَحۡیَیَ" تھی جس کی آخری متحرک "یاء" ماقبل مفتوح ہونے کے باعث "الف" میں بدل دی جاتی ہے۔ اصولی طور پر اس لفظ کی املاء "اَحۡیٰی" (الف مقصورہ کے ساتھ) ہونی چاہیے مگر یہ لفظ خلافِ قیاس "احیا" ہی لکھا جاتا ہے۔ اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد کے استعمال اور معنی پر البقرہ: ۲۶ یعنی ۲:۱۹:۱(۱) میں بات ہو چکی ہے۔

● "اَحۡیَا" اس مادہ (حیی) سے باب افعال کا فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اَحۡیَا..... یُحۡیِیۡ (دراصل اَحۡیَیَ یُحۡیِیُ) اِحۡیَاءً" کے بنیادی معنی ہیں: "..... کو جلانا، ..... کو جاندار کرنا، ..... میں جان ڈالنا، ..... کو جان بخشنا، ..... کو زندگی دینا یا زندہ کرنا"۔ یعنی یہ فعل ہمیشہ متعدی اور مفعول بنفسہٖ کے ساتھ آتا ہے (بغیر صلہ کے) ـــ اور اس کے فاعل اور مفعول کے طور پر مختلف اشیاء کے ذکر سے اس میں بھی مختلف محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں (مثلاً احیا اللّیلَ = اس نے رات بھر عبادت کی) اس طرح "فَاَحۡیَاکُمۡ" کا ترجمہ "پھر اس نے تم کو جِلایا، زندگی دی، جان بخشی" وغیرہ (مندرجہ بالا مصدری معنی کے ساتھ) کیا جا سکتا ہے۔

یہ کلمہ (اَحۡیَا) اور اس کے باب (افعال) سے مختلف صیغے قرآن کریم میں پچاس جگہ وارد ہوئے ہیں۔

۲ : ۲۰ : ۱ (۴) [ثُمَّ] کا مادہ "ث م م" اور وزن "فُعَلَ" ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے کوئی فعل نہیں آیا۔ بلکہ صرف ایک دو حرف ہی آئے ہیں جن میں سے ایک یہ "ثم" ہے جو حرف عطف ہے اور بلحاظ معنی کسی کام یا حکم میں "ترتیب مع تراخی" (یعنی نمبروار ایک کے بعد دوسرے کا اور کچھ وقفہ سے واقع ہوتے) کا مفہوم دیتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ حسب موقع "پس، پھر، سو، اس کے بعد، دوبارہ، مزید برآں" کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے ترتیب زمانی مراد نہیں بھی ہوتی، بلکہ صرف تاکید اور زور دینے یا استیناف کے لیے آتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر "پھر یہ بات بھی تو قابل ذکر ہے کہ ....." کا مفہوم موجود ہوتا ہے، اگرچہ اردو میں عموماً اس قسم کے "ثُمَّ" کا ترجمہ بھی "پس یا پھر" سے کر دیتے ہیں۔ (اس کی ایک مثال الانعام ۱۵۴ میں ہے) کبھی یہ "باربار" بلکہ بطور محاورہ "سوبار، ہزار بار" کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے "كَلَّا ..... ثُمَّ كَلَّا ....." (ہرگز نہیں ..... سوبار ہرگز نہیں .....) قرآن کریم میں "ثُمَّ" کے یہ تمام استعمالات آئے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں "ثُمَّ" ترتیب مع تراخی یعنی "پھر اس کے (کچھ عرصہ) بعد" کے معنی میں آیا ہے۔

۲ : ۲۰ : ۱ (۵) [يُمِيْتُكُمْ] کی آخری ضمیر منصوب (كُمْ) تو یہاں "تم کو یا تمہیں" کے معنی میں ہے اور فعل "يُمِيْتُ" کا مادہ "م و ت" اور وزن اصلی "يُفْعِلُ" ہے جس کی اصلی شکل "يُمْوِتُ" تھی پھر حسب قاعدۂ تعلیل (یا عربوں کے استعمال کے مطابق) متحرک حرف علت (وِ) کی حرکت کسرہ (ــِـ) اس کے ماقبل حرف صحیح (م) کو دے کر خود اس واو (و) کو اپنی ماقبل (نئی) حرکت (کسرہ) کے موافق حرف (ی) میں بدل دیا جاتا ہے۔ یعنی يُمْوِتُ = يُمِوْتُ = يُمِيْتُ ہو جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کے بارے میں ابھی اوپر "امواتا" کے تحت ۲ : ۲۰ : ۱ (۲) بات ہو چکی ہے۔

● لفظ "يُمِيْتُ" اس مادہ (م و ت) سے باب افعال کا فعل مضارع واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اَمَاتَ ..... يُمِيْتُ اِمَاتَةً" (دراصل

© rasailojaraid.c

اَمْوَتَ یُمَوِتُ اِمْوَاتًا) کے بنیادی معنی ہیں : "..... کو مردہ کرنا ، ..... کو مار دینا ، ..... کو موت دینا " پھر فاعل یا مفعول کے طور پر مختلف چیزوں کے ذکر سے اس میں بھی کئی محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اَمَاتَ فلانٌ غَضَبَہٗ (فلاں نے اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔ اس پر قابو پا لیا)

اس طرح " یُمِیْتُکُمْ " کا ترجمہ " وہ تم کو مردہ کرے گا ، وہ تم کو مار دیتا ہے ، موت دے گا ، مارتا ہے " کی صورت میں کیا جا سکتا ہے (فعل مضارع ، حال اور مستقبل دونوں کا کام دیتا ہے) ، قرآن کریم میں باب افعال کے اس فعل (اَمات) سے مختلف صیغے ۲۱ جگہ آئے ہیں۔ جس طرح لفظ حیات (زندگی) کے حقیقی اور مجازی متعدد معنی ہیں اسی طرح لفظ " موت " بھی متعدد حقیقی اور مجازی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے[1]

[ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ] " ثُمَّ " (پھر ، پس) اور " کُمْ " (ضمیر) کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان فعل " یُحْیِیْ " ہے (جس کی آخری یاء (ی) " کُمْ " کے ساتھ ملا کر لکھی جاتی ہے) اس (یُحْیِیْ) کا مادہ " ح ی ی " اور وزن اصلی " یُفْعِلُ " ہے اس کی اصلی شکل " یُحْیِیُ " تھی جس میں ماقبل مکسور (ح) ہونے کے باعث آخری " یاء " لکھنے اور بولنے میں ساکن کر دی جاتی ہے۔ اس کی عام عربی املاء " یُحْیِیْ " ہے۔ قرآنی املاء کا ذکر آگے بحث " الرسم " میں آئے گا۔

اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد پر ابھی اوپر " احیاکم " (۲ : ۲۰ : ۱ (۳)) میں بات ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ کلمہ " یُحْیِیْ " اپنے مادہ سے باب اِفعال کا فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ باب افعال کے اس فعل (اَحییٰ یُحْیِیْ) پر بھی ابھی اوپر ۲ : ۲۰ : ۱ (۳) میں بات ہوئی ہے۔ اس طرح " ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ " کا ترجمہ " پھر وہ تم کو زندہ کرے گا ،

---

[1] چاہیں تو تفصیل کے لیے دیکھئے المفردات (للراغب) تحت مادہ ح ی ی اور م و ت۔ جہاں حیات اور موت (ہر ایک) کی پانچ چھ " اقسام " یا معنیٰ مراد ممکن) کا ذکر کیا گیا ہے۔

جِلائے گا" ہے۔

[ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ] اس کی سیدھی سادی نثر تو "ثُمَّ تُرۡجَعُوۡنَ اِلَیۡہِ" ہے۔ پھر "فاصلہ" (شعر کے آخری لفظ کو قافیہ اور قرآنی عبارت میں خاتمۂ آیت کو "فاصلہ" کہتے ہیں) کی رعایت سے "تُرۡجَعُوۡنَ" کو آخر پر لایا گیا ہے۔ "ثُمَّ" کا ترجمہ "پھر، پس، اس کے بعد، دوبارہ" ہو سکتا ہے اور "الیہ" میں "اِلیٰ" جارّہ بمعنی "کی طرف" اور "ہ" ضمیر مجرور بمعنی "اس" ہے۔ یوں اِلَیۡہِ = "اس کی طرف۔ اس کی جانب یا اس کے پاس" ___ ہے۔

"تُرۡجَعُوۡنَ" کا مادہ "ر ج ع" اور وزن "تُفۡعَلُوۡنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (رجَع یرجِع) کے معنی (لوٹنا، لوٹانا) اور اس کے لازم اور متعدی استعمال پر اس سے پہلے البقرہ: ۱۸ یعنی ۲: ۱۳: ۱ (۱۵) میں بات گزر چکی ہے۔

● آیت زیر مطالعہ میں کلمہ "تُرۡجَعُوۡنَ" فعل رجَع یرجِع مَرۡجِعًا کے بطور فعل متعدی بمعنی "لوٹانا، واپس بھیجنا، پھیر دینا" سے فعل مضارع مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ اکثر نے "تم پھیرے جاؤ گے، لوٹائے جاؤ گے، واپس کیے یا لے جائے جاؤ گے" سے یعنی فعل مجہول کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "پلٹ کر جاؤ گے" اور بعض نے "تم کو (اس کے پاس) جانا ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست ہے مگر اصل الفاظ (متن) سے ذرا ہٹ کر ہے۔ کیونکہ ایک (پہلے) میں ترجمہ فعل لازم کی طرح کیا گیا ہے اور دوسرے میں ترجمہ "مصدر" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور مضارع کو مصدر بنانے کے لیے کوئی "عامل" (مَا یا اَن وغیرہ) درکار ہوتا ہے جو یہاں نہیں ہے۔

[هُوَ الَّذِیۡ] "هُوَ" ضمیر مرفوع منفصل (برائے واحد مذکر غائب) ہے جس کا ترجمہ "وہ" ہے اور "الّذی" اسم موصول برائے واحد مذکر بمعنی

© rasailojaraid.com

"جس نے" ہے۔ اس طرح "ھو الـذی" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے " وہ جس نے کہ"۔ مگر ھُوَ اور "الـذی" کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے (کیونکہ ویسے تو یہاں صرف " الـذی" بھی کام دے سکتا تھا) اب اس ترکیب میں ایک زور پیدا ہو جاتا ہے جس کو اردو میں " ہی" کے استعمال سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس طرح "ھو الـذی" کا بامحاورہ ترجمہ " وہی ہے جس نے کہ ....." یا " وہی تو ہے جس نے ......" سے کیا جاتا ہے۔

۲:۲۰:۱(۶) [خَلَقَ] کا مادہ "خ ل ق" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (خلَق یخلُق) کے بنیادی معنی "چمڑے کو کاٹنے سے پہلے صورت شکل ناپ وغیرہ کا اندازہ کرنا" ہیں۔ پھر اس سے اس میں "پیدا کرنا" اور "بنانا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ فعل نصر کے علاوہ بعض دوسرے ابواب (سمع اور کرُم) سے بھی مختلف معنی (مثلاً بوسیدہ ہونا، نرم ہونا) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ صرف باب نصر سے اور " پیدا کرنا یا بنانا" والے معنی کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ اس مادہ سے فعل (خلق) کے باب، معنی اور استعمال کے لیے مزید دیکھئے ۲:۱۶:۱(۳)۔

[لَكُمْ] جو لام الجر (لِ) بمعنی "کے لیے" اور "کُمْ" بمعنی "تمہارا/ تمہارے" کا مرکب ہے۔ لام الجر کے مختلف معنی ومفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے (دیکھئے الفاتحہ:۲ یعنی ۱:۲:۱(۴)) بعض اردو مترجمین نے "لَكُمْ" کا وضاحتی ترجمہ صرف "تمہارے لیے" کی بجائے "تمہارے فائدے کے لیے" کیا ہے۔

[مَا فِي الْاَرْضِ] یہ "مَا" (موصولہ بمعنی "جو کچھ کہ، جو کچھ بھی کہ اور سب کچھ جو" ہے) + "فِيْ" (حرف الجر بمعنی "میں") + الارض (بمعنی "زمین") کا مرکب ہے۔ [ضرورت ہو تو "ما" کے معانی کے لیے ۲:۲:۱(۵) اور ۲:۱۹:۱(۲)۔ "فِيْ" کے لیے ۲:۱:۱(۵) اور "الارض" پر بحث کے لیے ۲:۹:۱(۴) پر نظر ڈال لیجئے]۔

.com

۲: ۲۰: ۱ (۷) [جَمِيعًا] کا مادہ " ج م ع " اور وزن " فَعِيلاً " بصورت منصوب ہے (جس کے یہاں منصوب ہونے کی وجہ آگے " الاعراب " میں بیان ہو گی ۔)

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " جمَع ..... یجمَع جمعًا " (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: ...... کو اکٹھا کرنا (یعنی الگ الگ افراد یا اشیاء یا صفات کو یکجا کرنا) بلکہ لفظ " جمع " اردو میں مستعمل ہے اس لیے اس کا ترجمہ (معنی) "..... کو جمع کرنا" بھی کر سکتے ہیں۔ پھر یہ فعل حسی اور معنوی دونوں قسم کی چیزیں اکٹھی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً جمَعَ مَالاً (الھُمزہ : ۲) " اس نے مال اکٹھا کیا "۔ اور فجمَع کَیدَہ (طٰہٰ : ۶۰) " اس نے اپنا مکر (ساری تدابیر کو) جمع کیا " یہ فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر کسی صلہ کے فعل کے ساتھ ہی) آتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً جمَع فَاَوْعٰی (المعارج : ۱۸ یعنی " مال اکٹھا کیا " اور ان الناس قد جمعو الکم (آل عمران : ۱۷۳) یعنی " فوج " اکٹھی کر لی ہے "۔ اس فعل کے فاعل کو " جامع " اور مفعول کو مجموع اور جمیع بھی کہتے ہیں

● زیرِ مطالعہ لفظ (جمیع) کا وزن فعیل ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول ــ دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے (جیسے رحیم بمعنی راحم اور قتیل بمعنی مقتول ہے) اس طرح " جمیع " کے معنی حسب موقع " جامع " یا مجموع " ہو سکتے ہیں یعنی اشیاء یا صفات وغیرہ کو " اکٹھا کرنے والا "۔ یا جس میں کچھ اشیاء یا صفات وغیرہ جمع کر دی گئی ہوں مثلاً " قوم جمیع " (سب کے سب لوگ) اور " رجلٌ جمیع " (بھرپور جوان آدمی)۔

" جمیع " بلحاظ معنی " متفرق " (الگ الگ) کی ضد ہے یعنی اس لفظ میں " سب کے سب "، سارے "، سب کچھ " پورے کا پورا "، ایک ساتھ " کا مفہوم

© rasailojaraid.c

ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے اس کا ترجمہ ان ہی لفظوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا ہے۔ اور اسی مفہوم کے لحاظ سے یہ (جمیع) توکید (تاکید) کے لیے مقررہ چھ لفظوں میں سے ایک ہے اور "کُلٌّ" کے ہم معنی ہے۔ بطور تاکید استعمال ہوتے وقت اس کے ساتھ "مُؤَکَّد" کے مطابق ایک ضمیر بھی بھی آتی ہے۔ جیسے "قرأتُ الکتابَ جمیعَہ یا کُلَّہ" (میں نے ساری ساری کتاب پڑھی)۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (جمیع) کل چار جگہ آیا ہے اور "جمیعًا" کی شکل میں ۴۹ جگہ وارد ہوا ہے۔

۲:۲۰:۱(۸) [ثُمَّ اسْتَوٰی] "ثُمَّ" کے معنی و استعمال پر ابھی اوپر ۲:۲۰:۱(۴) میں بات ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ تو یہاں "پس یا پھر" ہی کیا گیا ہے تاہم بلحاظ مفہوم ممکن ہے کہ یہ ترتیب زمانی کے لیے نہ ہو بلکہ صرف تاکید یا استیناف کا ہو۔ فعل "استوٰی" کا مادہ "س و ی" اور بقول بعض "س و و"[۱] اور وزن اصلی "استفعل" ہے۔ اس کی اصل شکل "استَوَیَ" تھی جس میں آخری متحرک "یاء" (ی) ماقبل کے مفتوح ہونے کی بناء پر "الف (مقصورہ)" میں بدل جاتی ہے یعنی لکھی "ی" ہی جاتی ہے۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "سوِیَ یسوَیَ" کے باب اور معنی (ٹھیک ٹھاک ہو جانا) وغیرہ پر البقرہ: ۶ یعنی ۲:۵:۱(۲) میں بات گزر چکی ہے۔

● کلمہ "استوی" اس مادہ (سوو / سوی) سے باب استفعال کے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "استوی یستوی استواءً" کے معنی ہیں "ٹھیک ٹھاک ہو جانا، بھرپور جوانی میں ہونا یا پہنچنا،

---

[۱] القاموس المحیط اور اقرب الموارد میں اسے واوی اللام قرار دیا ہے جب کہ المنجد اور المعجم الوسیط میں اس کو یائی اللام سمجھا گیا ہے۔ مدالقاموس (Lane) میں عنوان کے طور پر دونوں مادے مذکور ہیں۔ ویسے عملاً واوی بھی یائی ہی استعمال ہوتا ہے۔

com

ٹھیک درمیان میں ہونا، تیار ہو جانا، سیدھا کھڑا ہونا" یہ فعل بنیادی طور پر لازم ہے مگر صلات کے ساتھ بطور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں: "..... پر قابو پانا، (کرسی یا سواری) پر جم کر بیٹھ جانا" اور "الیٰ" کے صلہ کے ساتھ (جیسے یہاں آیت زیرِ مطالعہ میں ہے) یا "لِ" کے ساتھ (قرآن کریم میں "لِ" کے ساتھ نہیں آیا) اس کے معنی ہوتے ہیں: "...... کا قصد کرنا"، "...... کی طرف چڑھنا"، "..... کی طرف توجہ کرنا"۔ عموماً یہ فعل (استویٰ الی .....) ایک کام ختم کرکے دوسرے کام کی طرف رخ کرنے یا اسے شروع کرنے کے لیے آتا ہے[1]۔ یہ فعل "الیٰ" کے صلہ کے ساتھ قرآن کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے۔

[اِلَى السَّمَاۗءِ] کا ابتدائی "اِلٰی" تو فعل "استویٰ" کا صلہ ہے جس کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اور لفظ "السماء" (بمعنی آسمان) کا مادہ "س م و" اور وزن لام تعریف نکال کر "فَعَالٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "سما یسمو سُمُوًّا و سَمَاءً" (باب نصر) کے بنیادی معنی: "اونچا ہونا، بلند ہونا، چڑھنا، نکل آنا" ہیں۔ پھر یہ فعل زیادہ تر معنوی اور بعض دفعہ حسی اشیاء کی بلندی (ہمت، حسب ونسب، نظر، ہلال، شوق وغیرہ) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "السماء" جو ایک طرح سے مذکورہ بالا فعل کا مصدر بھی ہے اور جس کے بطور اسم لفظی معنی "بلندی" ہیں، یہ عام طور پر "آسمان" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بلندی یا اونچائی کو بھی "سماء" کہتے ہیں۔ اور عربی زبان میں بادل اور بارش کو بھی "سماء" کہتے ہیں [دیکھئے البقرہ: ۱۹ یعنی ۲:۱۴:۱ (۳) میں نیز بحث "بسم اللہ" میں]

اس طرح "ثم استوی الی السماء" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پھر اس نے قصد کیا طرف آسمان کے" ـــ اور اسی کو بامحاورہ بناتے ہوئے بیشتر مترجمین نے "پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا / توجہ فرمائی" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "آسمان کی طرف

[1] دیکھئے العمدۃ فی غریب القرآن (للقیسی) ص ۷۲

© rasailojaraid.com

چڑھ گیا یا آسمان کو چڑھ گیا" بھی کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے یا پرانی (متروک) اردو ہے۔

۲: ۲۰: ۱ (۹) [فَسَوّٰهُنَّ] یہ فَ + سَوّٰی + هُنَّ کا مرکب ہے۔ اس میں ابتدائی "فاء" (ف) تو عاطفہ بمعنی "پس"، "پھر" ہے اور آخری ضمیر منصوب برائے جمع مؤنث غائب (هُنَّ) کا ترجمہ "ان کو" ہے۔

ان دونوں (فَ اور هُنَّ) کے درمیان فعل "سَوّٰی" ہے جس کا مادہ "س و و / س و ی" اور وزن "فَعَّلَ" ہے۔ اصلی شکل "سَوَّیَ" تھی جس میں آخری متحرک "یاء" ماقبل کے مفتوح ہونے کے باعث الف (مقصورہ) میں بدل جاتی ہے یعنی لکھی "ی" ہی جاتی ہے مگر اسے پڑھا "الف" کی طرح جاتا ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد (سوِی یسوٰی) کا ذکر ابھی اوپر "استوی" کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

● "سَوّٰی" اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "سَوّٰی ...... یُسَوِّیْ تَسْوِیَةً" کے معنی ہیں: ...... کو برابر کر دینا، ...... کو ٹھیک ٹھاک کر دینا، ..... کی ہر طرح سے تکمیل کر دینا، درست کرنا، ہموار کرنا، اور درست کر کے بنانا"۔ اس فعل (سَوّٰی یُسَوِّی) کے مختلف صیغے قرآن کریم میں دس سے زیادہ جگہ آئے ہیں۔

۲: ۲۰: ۱ (۱۰) [سَبْعَ سَمٰوٰتٍ] میں "سماوات" (یہ اس کا رسم معتاد ہے۔ رسم قرآنی پر "الرسم" میں بات ہو گی) تو لفظ "سماء" (آسمان) کی جمع مؤنث سالم ہے جس کی اصلی شکل تو "سماءات" تھی مگر جمع میں "سماء" کے اصل "واو" لوٹ آتی ہے (سَمَاءٌ دراصل "سَمَاوٌ" بروزن "فَعَالٌ" تھا جو الف ممدودہ کے بعد آنے کی وجہ سے "ء" میں بدل گئی تھی)

لفظ "سماء" (جو سماوات کا واحد ہے) کے مادہ وغیرہ پر ابھی اوپر

بات ہو چکی ہے۔

● پہلے لفظ "سَبْعَ" کا مادہ "س ب ع" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ ("سبعَ" میں "ع" کی فتحہ کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہو گی)۔ عربی زبان میں اس مادہ (سبع) سے فعل مجرد اور مزید فیہ کے متعدد باب مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن میں "سات" کا لفظ شامل رہتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: "سبعَ القومَ = ... کی گنتی سات کر دی"۔ "اسبَعَ القومُ = پورے سات (عدد) ہو جانا"، "سبَّعَ الاناءَ = برتن کو سات مرتبہ دھونا"۔ وغیرہ۔ تاہم قرآن حکیم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔

● کلمہ "سَبْعٌ" کے معنی ہیں: سات۔ جو کسی مؤنث معدود (یا تمیز) کے لیے اسم عدد ہے۔ مذکر معدود کے لیے "سبعة" کا لفظ آتا ہے۔ قرآن کریم میں کلمہ "سبْع" مختلف صورتوں میں ۲۱ جگہ اور "سبعَة" ۴ جگہ آیا ہے۔ اور اسی سے ماخوذ لفظ "سبعون" (بمعنی ستر) بھی تین جگہ وارد ہوا ہے اور اسی مادہ سے ماخوذ لفظ "السبُعُ" (بمعنی درندہ جانور) بھی ایک جگہ (المائدہ: ۴) آیا ہے۔ ان پہ اپنے موقع پر بات ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

"سبع سماوات" کا ترجمہ بنتا ہے "سات آسمان"۔ پورے جملے میں اس کے ترجمہ کی بعض صورتوں پر "الاعراب" میں بحث ہو گی۔

۲: ۲۰: ۱ (۱۱) [وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ] یہ ایک پورا جملہ ہے جس کی سیدھی سادی نثر تو بنتی ہے "وَهُوَ عَلِيمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ"۔ پھر "فاصلہ (آیت) کی رعایت سے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ جو عبارت میں شعر کا سا رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے کہیں بیان ہو چکا ہے کہ اس قسم کے ادبی اسلوب کی بناء پر ہی کفارِ مکہ قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے۔ حالانکہ یہ اسلوب "شعر" نہیں ہے۔ اور کفار کے سمجھدار لوگ بھی اس "الزام" کو غلط قرار دیتے تھے۔ آخر عرب کے لوگ "شعر و شاعری" کے اسالیب سے اتنے

© rasailojaraid.com

ناواقف تو نہیں تھے۔

● مندرجہ بالا جملہ کے قریباً سب الفاظ کے معنی سے اب تک آپ واقف ہو چکے ہیں مثلاً "کلّ شیئ ٍ" کے معنٰی (ہر چیز) اور اجزاء پر الگ الگ البقرہ : ۲۰ یعنی ۲ : ۱۵ : ۱ کے آخر پر بات ہوئی تھی۔ "وھو" (اور وہ) تو بہت ابتدائی لفظ ہیں۔ البتہ لفظ "علیم" کی مختصر وضاحت شاید ضروری ہے۔ اس لفظ (علیم) کا مادہ "ع ل م" اور وزن "فَعِیْلٌ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد (علِم یعلَم = جان لینا) کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ : ۲ کے علاوہ البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱۰ : ۱ (۳) میں بھی بات ہو چکی ہے۔

یہ فعل (علِم) زیادہ تر مفعول بنفسہ کے ساتھ (علِمہ) اور کبھی باء کے صلہ کے ساتھ (علِم بہ = ... کو جان لینا ... کا علم رکھنا) بھی استعمال ہوتا ہے۔

● اس طرح یہاں "علیم بِ ......" کے معنی ہیں : ..... سے خوب آگاہ، ..... کا خوب جاننے والا، خبردار، واقف"۔ "علیم" چونکہ صفت مشبہ ہے اس لیے اس میں صفتِ علم کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے یعنی ہمیشہ اور ہر جگہ (ہر شے کو) جاننے والا۔

یوں "وھو بکل شیئ ٍ علیم" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے : "اور وہ ہر چیز کے بارے میں خوب علم رکھنے والا ہے"۔ بعض حضرات نے اس جملہ اسمیہ کا ترجمہ جملہ فعلیہ کی طرح کر دیا ہے اس پر ہم آگے "الاعراب" میں بات کریں گے۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

.com

com